رسائل و مسائل

قضا و قدر

قرآن کریم کی آیتِ کریمہ "بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۝ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ" کے مطالعہ سے درج ذیل اشکال ذہن میں ابھر رہے ہیں۔

آیت کے مطابق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل ہی قرآن لوح محفوظ میں مکتوب شکل میں موجود تھا' جسے بعد میں تھوڑا تھوڑا کرتے ہوئے نازل کیا گیا۔ یعنی نبی اکرمؐ کی نبوت کے دوران گزرنے والے واقعات و حادثات' غزوات' سرایات' طائف کا سفر' حضور کا پتھر کھانا' صلح حدیبیہ وغیرہ پہلے سے ان کا ہونا طے شدہ حالت میں مکتوباً موجود تھا۔ تو پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان واقعات سے کیونکر گزارا گیا۔ اسے اس طرح بھی کہا جاسکتا ہے کہ سکرپٹ پہلے سے موجود تھا' جس پر بعد میں عمل کیا گیا۔

اس سے دوسرا پہلو بھی ذہن میں ابھرتا ہے۔ اگر ایسا ہی ہونا تھا تو شیطان بھی پھر بے قصور ہے کہ اسے پہلے سے طے شدہ امر کے تحت ان مراحل سے گزارا گیا۔ اور اس نے بھی سکرپٹ کے تحت اپنا کردار ادا کیا۔ پھر اس کا قصور تو نہ ہوا۔ مزید یہ کہ اگر یہ ساری ڈرامائی تشکیل ہے تو ایکٹر کو اپنے کردار کا پہلے سے علم ہوتا ہے' تو اس پورے قرآن کو ڈرامائی تشکیل دینا ایکٹرز کے علم میں تھا یا نہیں ؟

آپ نے "فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ" کے متعلق جس اشکال کا ذکر کیا ہے' وہ اشکال درحقیقت قضا و قدر کے بارہ میں ہے۔ تقدیرِ الٰہی کا معاملہ صرف قرآن کریم میں لکھی ہوئی باتوں تک محدود نہیں۔ کوئی پتّہ بھی ایسا نہیں گرتا جس کا اسے علم نہ ہو' اور جو ایک کھلی کتاب میں لکھا ہوا نہ ہو (الانعام : ۵۹)۔ بلکہ معاملہ علم سے بھی آگے ہے۔ زمین و آسمان میں ایک پتّہ بھی اس کے حکم کے بغیر نہیں ہل سکتا۔ کوئی کام ' نیکی یا گناہ' اس کی اجازت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اصل سوال یہ ہے کہ پھر اطمینان کیسے ہو کہ انسان مجبور نہیں' اور اپنے اعمال کے لیے جزا و سزا کا سزا وار ہے؟

اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہ ذہن میں رکھیے کہ یہ مسئلہ ذاتِ باری تعالیٰ' اور کائنات میں

اس کے خلق و امر اور تدبیر و تصرف سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے اس کا کوئی ایسا جواب جو ہر شک اور ہر اعتراض کا ازالہ کردے ممکن نہیں۔ ورنہ پھر ایمان بالغیب کے مطالبہ 'اور امتحان' اور اس پر حساب اور جزا و سزا کا کوئی جواز نہ رہتا۔ اگر شک و اعتراض کی کوئی گنجائش نہ رہے تو انسان ماننے کے لیے مجبور ہوتا ہے۔ ایمان میں جبر نہیں ہو سکتا۔ یہ اپنے اختیار کی بات ہے۔

دوسری بات یہ کہ انسان مخلوق کے ذہن سے' اور مخلوق کی زبان میں سوچتا اور اظہارِ مدعا کرتا ہے۔ خالق کے بارہ میں مخلوق کی فہم' تصورات اور زبان پوری حقیقت سمجھنے اور بیان کرنے سے عاجز ہیں۔ اس لیے کہ خالق تو ایک ہی ہے (اَحَدٌ)' اور باقی ہر چیز مخلوق۔ اس میں تشویش کی کوئی بات نہیں۔ انسان تو آج تک مادہ کی حقیقت کی تہہ بھی نہیں پا سکا ہے۔

اس لحاظ سے "پہلے" اور "بعد" کے الفاظ خالق کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتے۔ وہ "اوّل" بھی ہے اور "آخر" بھی' "ظاہر" بھی ہے اور "باطن" بھی۔

تیسری بات یہ کہ اوّل آپ اس مسئلہ پر خالق کے پہلو سے غور کریں۔ اس کے علم کو لیجیے۔ اس کا علم اوّل و آخر پر محیط ہے۔ اگر اسے یہ علم نہ ہو کہ کوئی مخلوق کل کیا کرے گی' تو وہ مخلوق' خالق کی طرح ہو جائے گی۔ خالق کا علم ناقص ہو گا۔ حالانکہ خالق کو احد اور کامل ہونا چاہیے۔ لیکن کیا اس کے اس علم سے کہ کل ایسا ہوگا' کسی کا مجبور ہوجانا' مسئول نہ ہونا' ثابت ہوسکتا ہے۔ آپ نوکر کو بازار بھیجیں' کسی طرح آپ کو علمِ یقینی ہوجائے' بلکہ آپ مستقبل اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں' کہ وہ سودے میں چوری کرے گا' اور آپ اس بات کو لکھ بھی دیں --- تو کیا آپ کے علم اور لکھ دینے سے وہ اپنے چوری کے جرم کے لیے مجبور ہوجائے گا۔

اب اس کی قدرت اور مشیت کو لیجیے۔ اگر کائنات میں ایک پتّہ بھی اس کی اجازت کے بغیر ہلنے کی طاقت رکھتا ہو' تو خدائی سے باہر وہ پتّہ خود ایک خدا ہوگا۔ لیکن کائنات میں دو خدا نہیں ہوسکتے۔ اسی لیے لاحول ولا قوۃ الا باللہ اور ماشاء اللہ ولا قوۃ الا باللہ کہا گیا ہے۔

چوتھی بات یہ کہ اب مخلوق کے پہلو سے غور کریں۔ عملاً آپ کون سا کام کرنے کے لیے' کس نیکی کو کرنے کے لیے' کس برائی میں ملوث ہونے کے لیے' اپنے کو مجبور پاتے ہیں؟ آپ جو کام کرتے ہیں اپنے ارادہ سے کرتے ہیں۔ پھر نظری موشگافیوں میں الجھ کہ آپ انسان کو مجبور' بے قصور اور ایکٹر کیوں قرار دیں۔ انسان کا اپنے اعمال کے لیے مسئول ہونا تو اتنا صاف اور ظاہر ہے کہ آپ ایک کتے کو لکڑی سے ماریں' تو وہ بھی لکڑی کو کاٹنے نہیں دوڑے گا' آپ پر لپکے گا۔

ایک پہلو اور ہے۔ اگر انسان واقعی کلیتاً" مجبور ہی ہے' تو اسے اپنے بے قصور ہونے کا

دعویٰ کرنے، اپنے مجبور ہونے کا گلہ کرنے اور اپنی سزا پر اعتراض کرنے کا اختیار کہاں سے مل گیا؟

پانچویں بات یہ کہ انسان کو مجبوری کی تہمت سے بچانے اور با اختیار کرنے کے لیے اگر یہ ضروری ہو کہ اس کے اعمال کا علم اللہ کو نہ ہو، یا وہ اس کی مشیت و اجازت کے بغیر کوئی کام کر سکے، تو مجبوری کی یہ تہمت خود اللہ پر لگ جائے گی۔ ایسے ناقص خدا کو انسان کیسے اپنا دل دے گا، اپنا معبود بنائے گا، اس کے آگے ہاتھ پھیلائے گا، جس کی خدائی میں اس کی اجازت کے بغیر جس کا جو دل چاہے کرتا پھرے، اور اسے یہ پتہ ہی نہ ہو کہ کل کیا ہو گا۔

آخری بات یہ کہ، اس کے بعد بھی اگر آپ کو کوئی تضاد نظر آئے یا عقدہ لاینحل رہ جائے تو کھوج کرید سے رک کر آمنت باللہ کہیں۔ ورنہ بات وہیں پہنچے گی کہ پھر خدا کو کس نے پیدا کیا۔ اسی لیے قضا و قدر کے بارہ میں بحث و مباحثہ ناپسند کیا گیا ہے۔

آپ غور کریں گے تو تشفی کے لیے یہ نکات انشاء اللہ کافی ہوں گے۔ باقی رموزِ غیب کی پوری کنجیاں اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ (خ۔ م)

جماعت اور افراد کے اعمال

بحوالہ جسارت فرائیڈے سپیشل، آپ کے اس خیال سے میں بہت سوچ کے بعد بھی اتفاق نہ کرسکا کہ جماعتوں کو اپنے افراد کے کردار کے لیے جواب دہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس منطق کے مطابق پولیس والے خود جرائم میں ملوث ہوں تو محکمہ اور دوسرے ذمہ دار افراد بری الذمہ ہوں گے؟ جماعت اسلامی، مسلم لیگ اور پیپلزپارٹی میں کچھ فرق قائم رہ سکے گا؟ آپ آج کل جماعت کے ذہنی قائدین میں سے ہیں لیکن، اگر قیادت کی فکر یہی ہے تو ۔

کارِ طفلاں تمام خواہد شد!

شاید انٹرویو میں میری بات آپ پر پوری طرح واضح نہ ہوسکی۔ ورنہ یہ بات تو دین کے معروف بنیادی اصول پر مبنی ہے۔

میرا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ جماعتِ اسلامی، اپنے اندر اور باہر، دعوت الی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور تعلیم و تزکیہ کی ذمہ دار نہیں۔ بلکہ صرف یہ کہ وہ اپنے سے وابستہ افراد کے اعمال کے لیے مسئول، قابلِ ملامت اور موردِ الزام نہیں، الّا یہ کہ یہ اس کی اجازت سے ہوں اور وہ ان پر مناسب کارروائی نہ کرے۔

معاشرہ، ریاست، ادارہ، جماعت یا فرد اس بات کے لیے تو ذمہ دار ہے کہ وہ اپنی بساط بھر نیکی

کی دعوت دے، نیکی پر چلانے کی کوشش کرے، تعلیم و تزکیہ کا کام کرے، اور جہاں اختیار ہو وہ اجتماعی طور پر نیکیاں نافذ کرے۔ اس کے تحت کوئی فرد غلطی کرے، تو جہاں شرعی تقاضا ہو وہاں سزا دے (اگر اس کا حکم چلتا ہو)، ورنہ اصلاح اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے اصولوں اور حکمت کے مطابق تادیب کرے، تنبیہہ کرے، یا معاف کردے۔

لیکن ہر فرد اپنے نیک و بد اعمال کے لیے خود ہی ذمہ دار ہے، اور خود ہی مسئول اور قابل ملامت، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ یہ دین کا اتنا معروف و مسلّمہ اصول ہے کہ اس کے لیے کسی دلیل کی بھی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ، لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرٰى، وَكُلُّهُمْ اٰتِيهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَرْدًا، لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ، لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ، فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا، وغیرہ وغیرہ۔

جب کوئی فرد گناہ کرتا ہے، تو دوسرا فرد یا جماعت اس کے لیے اسی حد تک ذمہ دار ہے جس حد تک وہ اس گناہ کا باعث ہے، یا اس میں شریک۔ اور دوسرے کی اس ذمہ داری سے اس کی اپنی جواب دہی میں کوئی کمی نہیں آتی۔

کیوں کہ ہر شخص امتحان گاہ میں ہے اور اپنے عمل کے لیے مختار، اس لیے کوئی نظامِ تربیت، کوئی نظامِ تعزیر، کوئی نظامِ جماعت، کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ منزّی، یہاں تک کہ خود نبی و رسول بھی، اس بات کی ضمانت نہیں دے سکتے کہ ان کے ساتھ، یا ان میں شامل، کوئی فرد گناہ نہیں کرے گا۔ نہ وہ، اس کے گناہ کرنے کی صورت میں، اس کے لیے موردِ الزام اور جواب دہ ٹھہرائے جا سکتے ہیں۔

انبیا اور رسل پر بھی اس اصول کا اطلاق ہوتا ہے۔ ان سے بڑھ کر مزکّی کون تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نوح علیہ السلام اپنے بیٹے اور بیوی کے لیے، حضرت لوطؑ اپنی بیوی کے لیے، ذمہ دار اور مورد الزام نہیں ٹھہرائے گئے۔ مدینہ کے اوّلین معاشرہ میں، یا یوں کہیے کہ اس وقت کی جماعتِ اسلامی کے ارکان میں، لوگوں سے زنا کا جرم بھی سرزد ہوا، چوری کا بھی ہوا، میدانِ جنگ سے پلٹ آنے کا بھی ہوا، افک کا بھی ہوا ---- لیکن ان میں سے کسی کے لیے حضورؐ یا آپؐ کی جماعت اور معاشرہ کو ملامت نہیں کی گئی۔ آپؐ کی طرف سے یہ کافی تھا کہ آپؐ نے گناہ کو گناہ بتایا، ان سے روکا، سرزد ہوئے تو مناسب کارروائی کی۔ آپ بلاغ اور شہادت کے لیے ذمہ دار تھے۔ عرفات میں اسی کی گواہی پر آپؐ نے بات ختم کر دی۔

سوچیے، اگر آج جماعتِ اسلامی کے کسی رکن سے خدانخواستہ زنا کا گناہ سرزد ہوجائے تو کیا طوفان نہ مچے گا۔ (اور انسان ہونے کی حیثیت سے اس کا امکان تو ہر وقت موجود ہے)۔ "جماعت

بقیہ بر صفحہ ۲۵